درس نمبر 1

الحاد: قرآنی آیات، احادیث، علمِ کلام اور تاریخی تناظر میں ایک مفصل اور جامع جائزہ

الحاد محض ایک عقلی استدلال نہیں، بلکہ ایک فکری اور روحانی انحراف ہے جو انسان کو خالق کی نشانیوں اور آخرت کے یقین سے دور لے جاتا ہے۔

قرآنی تناظر:

قرآن مجید الحاد کو واضح طور پر مخاطب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، اللہ تعالیٰ سورہ فصّلت کی آیت 40 میں فرماتے ہیں" :**إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا** "یعنی بے شک جو لوگ ہماری آیات میں کج روی کرتے ہیں، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ آیت الحاد کی ان تمام صورتوں کو شامل کرتی ہے جہاں اللہ کی نشانیوں کو نظر انداز یا مسخ کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سورہ الصّافات کی آیت 16 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" :**أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ** "یعنی کیا جب ہم ہڈیاں اور خاک ہو جائیں گے تو کیا ہم واقعی دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہاں انکارِ آخرت کو بھی الحاد کے ایک مظہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

احادیث کا تناظر:

نبی کریم ﷺ نے بھی الحاد کے ذہنی اور نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ایک مشہور حدیث (صحیح بخاری، کتاب البداء، حدیث نمبر 3276) میں آتا ہے کہ شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے: "یہ چیز کس نے پیدا کی؟ وہ چیز کس نے پیدا کی؟" یہاں تک کہ وہ کہتا ہے: "فَمَنِ خَلَقَ رَبَّکِ؟" "تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ اسی طرح مسلم کی ایک حدیث (صحیح مسلم، کتاب الِایمان) میں بھی یہی مضمون ملتا ہے کہ اگر ایسا وسوسہ آئے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگے۔

اہلِ علم حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یقین کے بعد شک اور وسوسہ ایمان کے لیے ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ یعنی یقین کے بعد آنے والا شک اور وسوسہ انسان کے ایمان کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی لیے اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمِ کلام کا تعارف اور کردار:

الحاد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ تاریخ میں علمائے اسلام نے کن طریقوں سے ملحدانہ نظریات کا مقابلہ کیا۔ **علمِ کلام** ایک ایسا اسلامی علمی منہج ہے جس کے ذریعے عقلی اور نقلی دلائل کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے وجود اور دیگر ایمانیات کا دفاع کیا جاتا ہے۔

تاریخ میں امام غزالیؒ جیسے جلیل القدر علماء نے علمِ کلام کو استعمال کرتے ہوئے یونانی فلسفے کے اثرات کو رد کیا اور اسلامی عقائد کا بھرپور دفاع کیا۔ امام ابن تیمیہؒ اور امام سعد الدین تفتازانیؒ

جیسے علماء نے بھی اپنے زمانے کے ملحدانہ اور فلسفیانہ اعتراضات کا نہایت عقلی اور منطقی جواب دیا۔

علمِ کلام کا یہ کردار خاص طور پر اس وقت سامنے آیا جب مختلف فلسفیانہ نظریات یا دہریہ سوچ اسلام کے بنیادی عقائد کو چیلنج کر رہے تھے۔ ان علماء نے اللہ کے وجود، وحی اور آخرت جیسے موضوعات پر عقلی دلائل دیے اور ملحدوں کے اعتراضات کو خاموش کر دیا۔

تاریخی پس منظر:

تاریخ کے مختلف ادوار میں الحاد کی مختلف شکلیں رہی ہیں۔ کبھی یہ فلسفیانہ سوالات کی صورت میں، اور کبھی جدید دور میں مادہ پرستانہ نظریات کی شکل میں سامنے آتا رہا ہے۔ ہر دور میں اس کا بنیادی مقصد حق اور خدا کے تصور سے انکار یا انحراف رہا ہے۔

نتیجہ:

الحاد دراصل ایک ایسا فکری رویہ ہے جو انسان کو حقیقت سے دور اور شک و شبہات میں مبتلا کرتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس سے بچنے کا بہترین طریقہ اللہ کی نشانیوں پر غور و فکر کرنا اور اپنے ایمان کو مضبوط کرنا ہے۔ اور جب ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں تو علمِ کلام جیسے مضبوط علمی اوزاروں سے علمائے اسلام نے الحاد کے فلسفے کا علمی اور منطقی جواب دیا ہے۔

الحاد کی جدید صورتیں اور ان کے مفہومات

موجودہ دور میں الحاد کی کئی شکلیں اور اصطلاحات رائج ہیں جنہیں سمجھنا ضروری ہے۔ ہم ان میں سے ہر ایک کا تعارف ایک ایک کر کے کریں گے تاکہ آپ کو ان کے مفہوم، ان کی لغوی جڑوں اور ان کے نظریاتی پس منظر کا اندازہ ہو سکے۔

1.ایتھیزم:(Atheism)

ایتھیزم کا لفظ یونانی لفظ ἄθεος (atheos) سے ماخوذ ہے۔ یہاں "a-" کا مطلب ہے "بغیر" اور "theos" کا مطلب ہے "خدا"۔ یعنی ایتھیزم کا لغوی معنی ہوا "بغیر خدا کے"۔ یہ اصطلاح ان لوگوں کے نظریے کو ظاہر کرتی ہے جو خدا کے وجود کو نہیں مانتے۔

2.میٹیریلزم:(Materialism)

میٹیریلزم یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف مادہ ہی حقیقت رکھتا ہے اور ہر چیز مادے پر مشتمل ہے۔ یہ نظریہ خدا یا کسی غیر مادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔

3.ایگناسٹیسزم:(Agnosticism)

ایگناسٹیسزم، جسے اردو میں "لادریت" کہا جا سکتا ہے، اس نظریے کا نام ہے جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے وجود یا عدم وجود کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس نظریے کے حاملین نہ خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں نہ اس کا انکار کرتے ہیں، بلکہ وہ اسے غیر معلوم یا غیر قابل تصدیق سمجھتے ہیں۔

4.ہیومنیزم:(Humanism)

ہیومنیزم ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی اقدار، انسانی عقل اور انسانی تجربات پر زور دیتا ہے۔ یہ نظریہ مذہبی عقائد کی بجائے انسان کو مرکز بناتا ہے۔

5.سیکولرزم:(Secularism)

سیکولرزم ریاست اور مذہب کو الگ رکھنے کا نظریہ ہے۔ اس میں مذہبی امور کو نجی دائرہ میں رکھا جاتا ہے اور ریاستی معاملات مذہب سے متاثر نہیں ہوتے۔

6.لبرلزم:(Liberalism)

لبرلزم فرد کی آزادی، حقوق اور مساوات پر زور دینے والا نظریہ ہے۔ یہ ایک سیاسی اور اخلاقی فلسفہ ہے جو انفرادی آزادیوں کی حفاظت کو اہمیت دیتا ہے۔

7.نیہلزم:(Nihilism)

نیہلزم یہ عقیدہ ہے کہ زندگی کی کوئی موروثی معنیات یا اقدار نہیں ہوتیں۔ یہ ایک نفی کا فلسفہ ہے جو تمام قائم شدہ اقدار کو رد کر دیتا ہے۔

8.دیگر فلسفیانہ تصورات:

- Metaphysics: وہ شاخِ فلسفہ جو مابعد الطبیعاتی مسائل پر غور کرتی ہے۔
- Self-existent: وہ وجود جو خود بخود قائم ہو۔
- Dependent on others: وہ وجود جو دوسروں پر انحصار کرے۔

- Eternal: وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
- Created: جو کسی کے ذریعے پیدا کیا گیا ہو۔
- Contingent being: ایسا وجود جو ممکن ہے کہ ہو یا نہ ہو۔
- Necessary being: ایسا وجود جس کا ہونا ضروری ہے۔
- Impossible: محال یعنی جو ممکن نہ ہو۔

ان کے علاوہ:

- Intrinsically impossible: جو اپنی ذات میں ہی ناممکن ہو۔
- Legally impossible: جو قانوناً ناممکن ہو۔
- Customarily impossible: جو رواجاً ناممکن ہو۔

درس نمبر2

اصول نمبر 1: کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

عنوان: سمجھ میں نہ آنا اور باطل ہونا—ایک اصول کی وضاحت

کسی چیز کا صرف سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں۔ اس اصول میں دراصل دو الگ الگ باتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا ایک الگ معاملہ ہے اور کسی چیز کا واقعی باطل ہونا ایک دوسرا معاملہ۔

جب لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک دیہاتی جس نے کبھی ٹرین نہیں دیکھی، وہ سن کر حیران ہو سکتا ہے کہ ایک گاڑی اتنے لوگوں کو کیسے خود سے لے جا سکتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آنا اس بات کی دلیل نہیں کہ ٹرین کا وجود باطل ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ آج بھی گریویٹی کو نہیں سمجھ پاتے، مگر ان کی لاعلمی گریویٹی کے انکار کی دلیل نہیں بن سکتی۔ دوسری جانب کسی چیز کے باطل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف واقعی مضبوط عقلی یا نقلی دلائل موجود ہوں۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ کسی کافر کو محض کسی بزرگ کے رشتے کی وجہ سے بخش دیا جائے گا، جبکہ اس کے خلاف واضح دینی دلائل موجود ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات باطل ہے۔

خلاصہ یہ کہ سمجھ نہ آنا اور باطل ہونا دو الگ چیزیں ہیں۔ ہمیں ان دونوں کو الگ رکھنا چاہیے اور اسی اصول کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اصول نمبر دو: جو امر عقلاً ممکن ہو اور دلیلِ نقلی صحیح اس کے وقوع کو بتاتی ہو، تو اس کے وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر دلیلِ نقلی اس کے عدمِ وقوع کو بتائے تو اس کے عدمِ وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔

واقعات کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جن کے ہونے کو عقل ضروری اور لازم قرار دیتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک دو کا آدھا ہے۔ یہ ایسا لازمی امر ہے کہ جو بھی ایک اور دو کی حقیقت جانتا ہے وہ اسے تسلیم کرے گا اور اس میں غلطی نہیں کرے گا، اور اسے ایک کا آدھا ماننا واجب ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جن کے نہ ہونے کو عقل ضروری اور لازمی بتاتی ہے، جیسے یہ کہ ایک دو کے برابر ہو جائے۔ یہ ایسی ناممکن چیز ہے جسے عقل غلط سمجھے گی، کیونکہ یہ محال ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جن کے ہونے یا نہ ہونے کو عقل لازمی نہیں سمجھتی، یعنی دونوں امکان برابر ہوتے ہیں۔ ایسے معاملات میں کسی اور نقلی دلیل کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ ان کے ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔

اس تیسری قسم کو مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے اختیار اور براہِ راست مشاہدے سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں عقل نہ تو خود سے ان کے ہونے کو لازمی کہتی ہے اور نہ ان کے نہ ہونے کو لازمی قرار دیتی ہے۔ یعنی یہ ایسے ممکن امور ہیں جو ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ مثال

کے طور پر یہ کہنا کہ فلاں شہر کا رقبہ کسی دوسرے شہر کے رقبے سے زیادہ ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جسے جانچنے سے پہلے عقل نہ قطعی طور پر صحیح مانے گی اور نہ غلط۔

دوسرے لفظوں میں، جب تک ہم خود تحقیق نہ کر لیں یا ان لوگوں کی تقلید نہ کر لیں جنہوں نے تحقیق کی ہے، اس وقت تک عقل اس معاملے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی۔ یعنی یہ ایسی صورت ہے جس میں دلیلِ نقلی یا کسی معتبر تحقیق کے بغیر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

پس اگر دلیلِ نقلی صحیح سے یہ ثابت ہو جائے تو اس کے وقوع کو ماننا ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر دلیل اس کے عدمِ وقوع پر دلالت کرے تو اس کے نہ ہونے کو ماننا لازمی ہو جاتا ہے۔

(اس مثال میں، جب ہم جانچ کر لیتے ہیں تو بعض جگہوں پر ہم اسے درست کہیں گے اور بعض جگہوں پر غلط۔ اسی طرح آسمانوں کا سات ہونا، جس پر جمہور اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے، یہ عقلاً ممکن تو ہے، مگر صرف عقل اس کے ہونے یا نہ ہونے پر کوئی حتمی دلیل نہیں دے سکتی۔ عقل دونوں امکانات کو ممکن سمجھتی ہے، اس لیے اس معاملے میں فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں نقلی دلیل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔)

اسی طرح کائنات سے متعلق امور، جیسے آسمان **سات ہے**، جنت، جہنم، فرشتے وغیرہ — یہ سب ایسے حقائق ہیں جنہیں عقل بذاتِ خود نہ قطعی طور پر ثابت کر سکتی ہے اور نہ قطعی طور پر رد۔ ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم ان امور کو سمجھنے کے لیے **دلیلِ نقلی** کا سہارا لیتے ہیں، اور یہ دلیل ہمیشہ ایک ہی معیار پر قائم رہتی ہے، اس میں تغیر نہیں آتا۔ وحی کا معیار بدلتا نہیں، اس کا حکم وقت کے ساتھ متغیر نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس ملحدین اور منکرینِ غیب ان حقائق کو سمجھنے کے لیے **سائنس** کو بنیاد بناتے ہیں۔ حالانکہ سائنس خود ایک متغیر علم ہے، اس کے نظریات وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک وقت میں سائنس کا یہ ماننا تھا کہ سورج اکیلا ہے، اس جیسا کوئی اور ستارہ موجود نہیں۔ لیکن طویل تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ سورج جیسے بے شمار ستارے موجود ہیں۔

یہ مثال واضح طور پر بتاتی ہے کہ جس بنیاد کو ہم نے اختیار کیا، یعنی دلیلِ نقلی، وہ ہمیشہ ایک ہی معیار پر قائم رہی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جبکہ جن لوگوں نے سائنس کو حتمی معیار بنایا، ان کے نظریات روز بروز بدلتے رہے۔

لہٰذا یہ مثال تیسری قسم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، یعنی وہ امور جن کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ عقل خود نہیں کرسکتی، بلکہ ان کے لیے کسی معتبر خارجی دلیل —— خصوصاً دلیلِ نقلی —— کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

اصول نمبر تین: محالِ عقلی ہونا اور چیز ہے اور مستبعَد ہونا اور چیز ہے۔ محال خلافِ عقل ہوتا ہے اور مستبعَد خلافِ عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جدا جدا ہیں، دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہو سکتا، مستبعَد واقع ہو سکتا ہے۔ محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور مستبعَد کو غیر مدرک بالفعل۔ ان دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔

اس اصول کو سمجھنا ضروری ہے کہ محالِ عقلی اور خلافِ عادت دو الگ معیارات ہیں۔ محالِ عقلی وہ تصور ہے جو عقل کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ ایک اور دو برابر ہیں، یا یہ تصور کرنا کہ کسی مثلث کے چار کونے ہوں۔ یہ تمام باتیں عقلی طور پر ناممکن ہیں۔

دوسری جانب خلافِ عادت واقعات وہ ہیں جو ہمارے عام تجربے اور عادت کے خلاف ہوں، لیکن عقلی لحاظ سے ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی بھی جاندار کے پیدا ہونے کے لیے نر اور مادہ کا ملنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن بعض غیر معمولی واقعات، جیسے مثال کے طور پر اگر مینڈک کو سکھا کر اسے کُوٹ کر بارش کے پانی میں ڈال دیا جائے تو وہاں سے سینکڑوں مینڈک پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر کسی نر اور مادہ مینڈک کا ملاپ نہیں ہوا ہوتا، پھر بھی مینڈک پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ خلافِ عادت ہے لیکن خلافِ عقل نہیں۔ اسی طرح سڑے ہوئے پھل میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور وہاں بھی نر و مادہ کا کوئی ملاپ نہیں ہوتا۔ یہ سب خلافِ عادت کی مثالیں ہیں

ہمارے تجربے میں خلافِ عادت ضرور ہے مگر یہ عقل کے اصولوں کے منافی نہیں ہے۔

اسی طرح انبیاء کے معجزات، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر والد کے پیدا ہونا، حضرت آدم علیہ السلام کا بغیر والدین کے پیدا ہونا، یا کسی معجزے کے طور پر اونٹنی کا پہاڑ سے نکل آنا، یہ سب واقعات خلافِ عادت ہیں لیکن عقل کے خلاف نہیں ہیں۔

جدید دور میں بعض ملحدین ان دونوں تصورات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ یوں اعتراض کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تو ایسی کوئی چیز پیدا کر کے دکھائے جو خود

اس سے بھی فنا نہ ہو۔ یہ دراصل ایک خلافِ عقل دعویٰ ہے، جسے وہ خلافِ عادت واقعات کی بنیاد پر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ جس طرح مسلمان یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ معجزے کے طور پر پہاڑ سے اونٹنی نکال سکتا ہے یا بغیر والدین کے کسی کو پیدا کر سکتا ہے، تو اسی طرح ایک ایسی شے بھی پیدا کر کے دکھائے جو کبھی فنا نہ ہو۔ اس طرح وہ ایک ایسی بات، جو عقل کے اصولوں کے لحاظ سے محالِ عقلی ہے، اسے خلافِ عادت کی مثالوں کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ درحقیقت ایک فکری مغالطہ ہے کیونکہ خلافِ عادت اور خلافِ عقل دو الگ معیارات ہیں، اور ان کو یوں خلط ملط کرنا درست نہیں۔

یہاں ہم اپنے قارئین کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ملحدین کس طرح ایک ایسی چیز جو عقلاً محال ہے، اسے ایک عادتن محال چیز کے ساتھ ملا کر لوگوں کے سامنے اس طرح خلط ملط کر کے پیش کرتے ہیں۔

اصول 4. موجود ہونے کے لئے محسوس و مشاہد ہونا لازم نہیں۔

کسی بھی واقعے یا حقیقت کو قبول کرنے کے لیے عام طور پر انسان تین طریقے اختیار کرتا ہے۔ پہلا طریقہ مشاہدہ ہے: مثلاًا گر کسی نے خود زید کو آتے ہوئے دیکھا تو یہ براہ راست مشاہدہ ہے اور اس کی بنیاد پر وہ یقین کر سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ ایک معتبر مخبرِ صادق کی خبر ہے: یعنی اگر کوئی سچا اور قابلِ اعتماد شخص یہ کہے کہ زید آیا تھا تو ہم اس کی خبر کو مان لیتے ہیں جب تک کہ اس کے خلاف کوئی اور مضبوط ثبوت نہ آ جائے۔

تیسرا طریقہ عقل کا استعمال ہے: جیسے ہم دھوپ دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سورج طلوع ہو چکا ہے، حالانکہ ہم نے خود سورج کو نہیں دیکھا۔

تاہم، مشاہدہ اور عقل دونوں میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ کسی نے دور سے ہوائی جہاز کو چھوٹا سمجھ لیا، یا عقل کا کوئی اندازہ غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن مخبرِ صادق کی خبر ایک ایسی بنیاد ہے جس پر اعتماد کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب بات نبی ﷺ جیسے سب سے بڑے مخبرِ صادق کی ہو، تو ان کی بتائی ہوئی خبر میں صدق اور سچائی ہوتی ہے۔ ان کی خبر کے خلاف کوئی بات نہیں کی جا سکتی، اور ان کا بیان جب تک تسلیم کیا جاتا ہے جب تک کہ اس سے بھی بڑا کوئی مخبرِ صادق اس کے خلاف نہ بولے۔ (اور یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ سب سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ نبی ﷺ سے بڑا کوئی مخبرِ صادق موجود ہے، جو ممکن نہیں۔)

اسی طرح جب نبی ﷺ نے بتایا کہ آسمان سات ہیں، یا اللہ، جنت، جہنم کے بارے میں جو کچھ بتایا، تو یہ سب چیزیں عملاً ممکن بھی ہیں اور نقلی دلیل سے بھی ثابت ہیں۔ اس لیے ان حقائق کا انکار کرنا خلافِ عقل ہوگا، جیسا کہ اصول نمبر دو کے مطابق جو چیز عقلاً ممکن ہو اور نقلی دلیل سے ثابت ہو، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اصول نمبر 5: منقولاتِ محضہ (یعنی احکامِ شرعیہ) پر محض عقلی دلیل قائم کرنا ممکن نہیں، اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں

منقولاتِ محضہ، یعنی احکامِ شرعیہ میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو عقل کی گرفت سے بالکل باہر ہوتے ہیں۔ جب کوئی حکم عقل سے ماوراء ہو، تو اس پر عقلی دلیل کا مطالبہ کرنا بھی درست نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر، جیسا کہ ہم نے اصول نمبر چار میں سیکھا تھا کہ کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جو محض خبر دینے والے کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں، اور جب تک کوئی اس سے بڑا اور زیادہ سچا خبر دینے والا اس کی مخالفت نہ کرے، تب تک وہ بات مانی جاتی ہے۔

اسی طرح ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا وقوع عام طور پر تاریخ میں ملتا ہے، جیسے بادشاہوں کے درمیان جنگیں ہونا۔ اگر کوئی کہے کہ مجھے اس تاریخی واقعے کو محض عقل سے ثابت کر کے دکھاؤ، تو یہ اس کی کم فہمی ہو گی۔ کیونکہ یہ چیزیں مؤرخین نے بیان کی ہیں، اور وہ خبر کے ناقل ہوتے ہیں، لہٰذا ان پر اضافی عقلی دلیل کا مطالبہ کرنا نادرست ہے۔

بالکل اسی طرح کچھ شرعی احکام بھی ایسے ہیں جو نبی ﷺ، جو سب سے بڑے اور سچے خبر دینے والے ہیں، کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ مثال کے طور پر فجر کی دو رکعتیں، ظہر کی چار رکعتیں، یا رمضان کے تیس روزے۔ یہاں یہ سوال کرنا کہ فجر میں دو ہی رکعتیں کیوں ہیں، یا رمضان میں تیس روزے ہی کیوں، مناسب نہیں۔

جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ ہفتے میں سات دن ہی کیوں ہیں، سال میں 365 دن ہی کیوں ہیں، مہینے میں اتنے دن ہی کیوں ہیں، یا سورج ادھر ہی کیوں نکلتا ہے اور اُدھر کیوں نہیں نکلتا—— ایسے سوالات کرنے والے اپنی جہالت یا بے خبری ظاہر کرتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح، جو شخص دین کے فرائض کے بارے میں مثلاً یہ سوال کرے کہ نماز میں اتنی رکعات ہی کیوں ہیں یا روزے اتنے ہی کیوں فرض ہیں، وہ بھی دراصل اسی قسم کے بے معنی سوالات کر رہا ہے۔

یہ احکام اپنی اصل میں عقل کی حد سے باہر ہیں، اور ان پر منطقی یا عقلی دلیل کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔

اصول نمبر چھ 6: نظیر اور دلیل، جس کو آج کل ثبوت کہتے ہیں، ایک نہیں ہیں۔ اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ جائز ہے، مگر نظیر کا مطالبہ جائز نہیں۔

یہ اصول کہتا ہے کہ کسی مدعی سے دلیل کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے اور یہ جائز ہے، لیکن اس سے یہ کہنا کہ پہلے کی کوئی ایسی نظیر یا مثال بھی پیش کرو، یہ ضروری نہیں۔ مثلاً اگر کوئی کہتا ہے کہ **محمد بن قاسم اور راجہ داہر** کی جنگ ہوئی تھی، تو اس سے جنگ کا ثبوت یعنی دلیل مانگی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ایسی ہی کوئی پہلے کی مثال بھی دو، یہ لازمی نہیں۔

اسی طرح اگر آج سے دس سال بعد کوئی کہے کہ 2019 میں کورونا کی وبا آئی تھی اور اس سے دلیل مانگی جائے تو یہ جائز ہے۔ اگر کوئی گواہ یا اس دور کی خبر پیش کر دی جائے تو بات مانی جائے گی۔ لیکن یہ کہنا کہ پہلے کوئی اور ایسی ہی وبا دکھاؤ تب ہی مانیں گے، یہ غلط ہے۔

اسی طرح اگر کوئی کہے کہ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں بولیں گے، تو اس کے لیے قرآن یا حدیث کی دلیل دینا کافی ہے۔ اگر کوئی اس کی پرانی نظیر مانگے تو یہ ضروری نہیں۔ ہاں، اگر کوئی اضافی طور پر آج کے دور میں کوئی مثال دے دے، جیسے بلوٹوتھ ڈیوائسز یا موبائل آواز پہنچا رہی ہیں، تو یہ اس کا احسان ہے، لیکن اصولی طور پر صرف دلیل ہی کافی ہوتی ہے۔

اسی طرح آج اگر نئی ٹیکنالوجی سامنے آتی ہے جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں تھی، تو صرف اس بنیاد پر اسے رد کرنا بھی جہالت ہے۔ دلیل اگر موجود ہے تو وہی کافی ہے، نظیر کی عدم موجودگی سے کسی چیز کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

مجموعی طور پر، اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ دلیل مانگنا درست ہے، مگر نظیر کا مطالبہ کرنا ضروری نہیں۔ اس طرح ہم ہر دور میں نئی چیزوں کو ان کی دلیل کی بنیاد پر قبول کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ ہمیں کوئی پرانی مثال ملے۔

درس نمبر 3

فلسفہ

فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جو دو لفظوں کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے: ایک "فیلو" یعنی محبت اور دوسرا "سوفیا" یعنی حکمت۔

یعنی یونانی زبان میں اس کا مطلب حکمت سے دلچسپی اور محبت ہے۔ حکمت کا مفہوم وسیع ہے اور کسی بھی چیز کی معرفت اور اس کی گہری معلومات حاصل کرنے سے جو دلچسپی ہو، وہی فلسفے کا میدان ہے۔

لفظ "فلسفہ" فارسی، اردو اور عربی زبانوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے، اور انگریزی میں اس کے لیے "philosophy" کا لفظ اسی یونانی اصل کے قریب تر ہے۔

(Philosophy is called "philosophy" in English. The etymological definition is that the word philosophy comes from the Greek words "philo," meaning love, and "sophia," meaning wisdom, which means love of wisdom.)

اصطلاحات کسے کہتے ہیں؟

اصطلاح دراصل وہ خاص الفاظ ہوتے ہیں جو کسی علم یا فن کے اندر ایک مخصوص مفہوم رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ عام استعمال سے ہٹ کر ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جو اس خاص علم میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان اصطلاحات کو آسانی سے سمجھتے ہیں۔ جیسے طب میں "تشخیص" یا منطق میں "قیاس" ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہر فن کی اپنی مخصوص زبان ہوتی ہے، اور جب آپ اس فن میں قدم رکھتے ہیں، تو یہ اصطلاحات آپ کو اس علم کی گہرائی میں لے جاتی ہیں۔ یوں اصطلاحات اس فن کی چابی ہوتی ہیں، جو دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دروازہ کھول دیتی ہیں، جہاں معنی اور فہم کی ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔

تعبیر کسے کہتے ہیں؟

تعبیر اس عمل کو کہتے ہیں جس میں کسی خواب، خیال یا علامت کی چھپی ہوئی معنوی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ دراصل کسی علامتی یا مبہم چیز کو سمجھنے اور اسے واضح الفاظ میں بیان کرنے کا فن ہے۔

فلسفہ کی اصطلاحی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ دراصل حکمت اور دانائی کی محبت کا علم ہے۔ یعنی فلسفہ وہ شعبہ ہے جس میں انسان حکمت، دانائی اور علم کے بنیادی سوالات پر غور کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو حکمت سے محبت کا فن کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے فلسفہ کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

حکمتِ عملیہ، یعنی عملی فلسفہ، اور حکمتِ نظریہ، یعنی نظری فلسفہ۔ عملی فلسفہ وہ ہے جو انسان کے اختیار میں آنے والے معاملات سے متعلق ہے۔ اس کی تین شاخیں ہیں: تہذیبِ اخلاق (اخلاقیات)، تدبیرِ منزل (معاشرتی نظم) اور سیاستِ مدنیہ (سیاست)۔

دوسری جانب نظری فلسفہ وہ ہے جو انسان کے اختیار سے باہر کے حقائق پر غور کرتا ہے۔ اس کی بھی تین شاخیں ہیں: علمِ الٰہی (میٹافزکس)، علمِ ریاضی (ریاضیات)، اور علمِ طبیعی (طبیعیات)۔

- **حکمتِ عملی (Practical Philosophy):** یعنی وہ فلسفہ جس کا وجود ہمارے اختیار میں ہو، مثلاً چلنا پھرنا، گھر چلانا یا سیاست کرنا۔
- **حکمتِ نظریہ (Theoretical Philosophy):** یعنی وہ فلسفہ جو ہمارے اختیار سے باہر ہو، جیسے اللہ کی ذات وصفات (Metaphysics)، علمِ ریاضی (Mathematics)، یا علمِ طبیعیات (Physics) وغیرہ۔

حکمتِ عملی کی آگے تین قسمیں ہوتی ہیں۔

- **پہلی قسم تہذیبِ اخلاق ہے،** جسے انگریزی میں ایتھکس (Ethics) کہتے ہیں، اور اس میں اخلاق کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا عمل شامل ہے۔
- **دوسری قسم تدبیرِ منزل ہے،** جسے سوشیالوجی (Sociology) کہا جاتا ہے، اور یہ گھر یا معاشرتی معاملات کو منظم کرنے سے متعلق ہے۔

- **تیسری قسم سیاستِ مدنیہ ہے**، جسے پولیٹکس (Politics) کہتے ہیں، اور یہ ریاست یا شہر کے نظم و نسق سے متعلق فلسفہ ہے۔ ان تینوں اقسام کے ذریعے عملی فلسفے کو مزید تقسیم کیا جاتا ہے۔

حکمتِ نظریہ یعنی تھیوریٹیکل فلسفی کی بھی تین اقسام ہوتی ہیں۔

پہلی ہے علمِ الٰہی جسے انگریزی میں میٹافزکس (Metaphysics) کہا جاتا ہے، دوسری ہے علمِ ریاضی یعنی میتھمیٹکس (Mathematics)، اور تیسری ہے علمِ طبیعی یعنی فزکس (Physics)۔ ان تینوں شعبوں کے ذریعے نظری فلسفہ ان مسائل پر غور کرتا ہے جو انسانی اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔

- علمِ الٰہی (Metaphysics) دراصل وہ علم ہے جس میں اللہ کی ذات اور صفات وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو نہ تو ذہنی طور پر اور نہ ہی خارجی طور پر ہمارے ادراک میں آتا ہے۔ یعنی جس کا تصور نہ ذہن میں مکمل طور پر آسکتا ہے اور نہ ہی اسے ہم خارج میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ کی ذات کا تصور، جسے ہم نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی پوری طرح ذہن میں لا سکتے ہیں۔
- علمِ ریاضی (Mathematics) ایسا علم ہے جو ذہن اور خارج دونوں میں اپنا وجود رکھتا ہے، لیکن یہ کسی مادی چیز پر منحصر نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر آپ دائرے کا تصور کریں تو آپ اسے اپنے ذہن میں بھی بنا سکتے ہیں اور کاغذ پر بھی کھینچ سکتے ہیں۔ لیکن دائرے کا تصور آپ کے ذہن میں کسی مادی چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس طرح ریاضی کے

اصول جیسے اعداد یا اشکال حقیقی دنیا میں بھی لاگو ہوتے ہیں اور ذہن میں بھی، بغیر اس کے کہ ان کا کوئی مادی وجود لازم ہو۔

- علمِ طبیعی یعنی (Physics) ایسا علم ہے جو ذہنی اور خارجی دونوں وجود رکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تاج محل کا تصور آپ کے ذہن میں بھی آ سکتا ہے اور وہ حقیقت میں بھی موجود ہے جسے آپ باہر دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح فزکس ان اصولوں کا علم ہے جو طبیعی دنیا میں لاگو ہوتے ہیں اور جن کا ادراک ہم اپنے ذہن میں بھی کر سکتے ہیں۔ یوں علمِ طبیعی کا تصور ذہن اور خارج دونوں میں ممکن ہے۔

دلیل

ہر علم میں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دلیل کو انگریزی میں "argument" یا "reasoning" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر مترادف الفاظ میں، جنہیں ہم اردو میں استدلال، برہان، تشریح، مفروضہ، حجت یا قیاس کہتے ہیں، ان کے لیے بھی انگریزی میں یہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

دلیل کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

پہلی ہے دلیلِ استقرائی (inductive reasoning) ،

دوسری ہے دلیلِ قیاسی (deductive reasoning) ،

اور تیسری ہے دلیلِ استنباطی (abductive reasoning) ۔

یعنی اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہر قسم کی دلیل کا اپنا ایک طریقۂ استدلال ہے,

- **نمبر ایک: دلیلِ استقرائی** (inductive reasoning) ، جس میں مخصوص مشاہدات سے ایک عام اصول اخذ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ نے یہ دیکھا کہ ہر بار جب یہ دوا استعمال کی گئی تو مریض ٹھیک ہو گیا، تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس دوا کے ذریعے شفا ملتی ہے۔ اس قسم کی دلیل عمومی اور مفروضی ہوتی ہے۔

(دلیلِ استقرائی یقیناً مفروضی ہوتی ہے اور اس میں کبھی کبھار غلطی بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ مخصوص مشاہدات کی بنیاد پر عمومی اصول نکالتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے مشاہدات مکمل نہ ہوں یا ان میں کوئی خامی ہو، تو نتیجہ بھی غلط ہو سکتا ہے۔)

- **نمبر دو دلیلِ قیاسی** (deductive reasoning) ۔ اس میں عمومی اصول سے مخصوص نتائج نکالے جاتے ہیں۔ یعنی اگر ہمارا ایک عمومی اصول صحیح ہو، تو اس سے خاص مقدمات کی بنیاد پر ایک یقینی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر ہم یہ مان لیں کہ تمام انسان فانی ہیں، اور ایک خاص فرد انسان ہے، تو اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ فرد بھی فانی ہے۔

- **نمبر تین دلیلِ استنباطی** (abductive reasoning) ۔ اس میں ہم بہترین ممکنہ وضاحت یا سب سے زیادہ معقول تفسیر تلاش کرتے ہیں۔ یعنی جب ہمارے پاس مختلف ممکنات موجود ہوں، تو ہم ان میں سے سب سے زیادہ قابلِ قبول اور معقول وضاحت کو چنتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کسی کمرے میں بکھری ہوئی کتابیں دیکھیں، تو آپ یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ شاید کوئی شخص وہاں سے گزرا ہے اور کتابیں گرا گیا ہے۔

اس طرح دلیلِ استنباطی میں ہم سب سے زیادہ معقول امکان کو منتخب کرتے ہیں۔

دلیل کے مختلف نام ہیں۔

۱ . برہان (proof): ایک حتمی اور ناقابلِ انکار دلیل۔

۲ . حجت (justification): کسی بات کی توثیق اور وضاحت کے لیے دلیل۔

۳ . اثبات (affirmation یا validation): نظریے کی تصدیق کرنے کا عمل۔

۴ . ثبوت (evidence): کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مواد۔

۵ . قیاس (inference) یا (deduction): مفروضہ کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کرنا۔

۶ . حوالہ (reference): کسی ماخذ یا کتاب پر مبنی دلیل۔

۷ . تشریح (explanation) یا (interpretation): کسی بات کی وضاحت

کرنا۔

۸ . مفروضہ (hypothesis) یا (premise): ایک ابتدائی نظریہ۔

۹ . قیاسِ معکوس (contraposition): ایک دلیل کو الٹ کر دیکھنا۔

۱۰ . تمثیل (analogy): کسی چیز کو دوسری چیز سے موازنہ کر کے دلیل دینا۔

۱۱ . تنقید (critique): کسی دلیل کی جانچ پڑتال اور اس پر تنقید کرنا۔

۱۲ . استدلالی نمونہ (syllogism): دو مقدمات سے ایک نتیجہ نکالنا۔

۱۳ . قیاسِ معکوس (contrapositive): دلیل کو الٹا کر کے دیکھنا۔

۱۴ . استدلالی سلسلہ (chain of reasoning): ایک دلیل کو دوسرے دلائل سے جوڑ کر پیش کرنا۔

۱۵ . مفروضاتی تجزیہ (hypothetical analysis): مفروضوں کی بنیاد پر تجزیہ کرنا۔

۱۶ . نتیجہ خیز استدلال (conclusive reasoning): ایسا استدلال جو حتمی نتیجہ دے۔

۱۷ . تنقیدی تجزیہ (critical analysis): دلیل کی گہری جانچ پڑتال۔

۱۸ . موازنہ (comparison): مختلف دلائل یا نظریات کا موازنہ کرنا۔

۱۹ . قیاسِ تجربی (empirical inference): تجربات کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کرنا۔

۲۰ . استقرائی تجزیہ (inductive analysis): مخصوص مشاہدات سے عمومی اصول اخذ کرنا۔

استدلال کی مختلف اقسام

۱ .استدلالِ تمثیل :(analogical argument) مثال کے طور پر، اگر ہم کہیں کہ چونکہ انسانوں کے دماغ اور کمپیوٹر دونوں معلومات کو پروسیس کرتے ہیں، اسی لیے ہم کمپیوٹر کو دماغ کی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

۲ .استدلالِ منطقی :(logical argument) مثال کے طور پر، اگر تمام انسان فانی ہیں اور سکندر ایک انسان ہے، تو نتیجہ یہ ہو گا کہ سکندر بھی فانی ہے۔

۳ .استدلالِ مفروضہ :(hypothetical argument) مثال کے طور پر، اگر بارش ہو جائے تو سڑکیں گیلی ہو جائیں گی۔ اگر ہم بارش کا مفروضہ لیں، تو پھر سڑکیں گیلی ہوں گی۔

۴ .استدلالِ اخلاقی :(moral argument) مثال کے طور پر، اگر ہم یہ کہیں کہ اچھائی اور برائی کی ایک عالمگیر سمجھ موجود ہے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی اقدار حقیقی ہیں۔

۵ .فلسفیانہ استدلال :(philosophical argument) مثال کے طور پر، وجودِ خدا کے حق میں فلسفیانہ دلائل جیسے کائنات کی ترتیب اور مقصدیت۔

۶ .تجرباتی استدلال :(empirical argument) مثال کے طور پر، اگر ہم دیکھیں کہ ایک خاص دوا ہمیشہ بیماری کو ٹھیک کرتی ہے، تو یہ تجرباتی بنیاد پر استدلال ہے۔

۷ .روحانی استدلال :(spiritual argument) مثال کے طور پر، روحانیت اور الہامی تجربات کی بنیاد پر دلیل دینا۔

۸ .استدلالِ تاریخی :(historical argument) مثال کے طور پر، ماضی کے واقعات کی بنیاد پر کسی نظریے کو ثابت کرنا۔

۹ .استدلالِ سائنسی :(scientific argument) مثال کے طور پر، سائنسی تجربات اور ثبوتوں کی بنیاد پر دلیل دینا۔

۱۰ .استدلالِ عقلی :(rational argument) مثال کے طور پر، منطقی اور عقلی اصولوں کی بنیاد پر دلیل دینا۔

منطقی مغالطوں کی وضاحت

۱ . **شخصی حملہ :(Ad Hominem)** اس مغالطے میں کسی کے دعوے کو رد کرنے کے لیے اس کی شخصیت پر حملہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر: "تمہاری بات غلط ہے کیونکہ تم ایک غلط انسان ہو۔"

۲ **.جذباتی اپیل :(Appeal to Emotion)** یہ مغالطہ اس وقت ہوتا ہے جب دلیل میں منطقی ثبوت کی بجائے جذبات کو شامل کر کے مخاطب کو قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳ . **فرضی دو راستے** (False Dilemma): اس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ صرف دو ہی راستے ہیں اور کوئی تیسرا راستہ موجود نہیں، حالانکہ درحقیقت اور بھی امکانات ہوتے ہیں۔

۴ . **جھوٹے سبب کا مغالطہ** (False Cause): اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ چونکہ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ ہوا ہے، اس لیے پہلا واقعہ دوسرے کا سبب ہے۔ مثال کے طور پر: "جب بھی میں امرود کھاتا ہوں تو بارش ہو جاتی ہے۔"

۵ . **منطقی گول مول دلیل** (Circular Reasoning): اس مغالطے میں دعوے کو ہی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال: "قرآن سچا ہے کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اور یہ اللہ کی کتاب ہے اس لیے سچا ہے۔"

۶ . **کٹھ پتلی کی دلیل** (Strawman Argument): اس میں کسی کے موقف کو توڑ مروڑ کر آسان ہدف بنایا جاتا ہے تاکہ اسے رد کیا جا سکے۔

۷ . **عوامی اپیل** (Bandwagon Appeal): اس مغالطے میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ کچھ مانتے ہیں، اس لیے وہی سچ ہے۔

۸ . **غلط تمثیل** (False Analogy): ایسی مثال دینا جو اصل معاملے سے مطابقت نہیں رکھتی۔

۹ . **ادھوری دلیل** (Hasty Generalization): بہت تھوڑے شواہد کی بنیاد پر کوئی عمومی نتیجہ نکال لینا، جیسے دو افراد کو دیکھ کر پوری قوم کے بارے میں رائے قائم کر لینا۔

دلیل کا بنیادی مقصد کسی بات کو ثابت کرنا یا کسی موقف کو تسلیم کرانا ہوتا ہے۔ اگر کسی کی دلیل مضبوط ہو، تو اس کی بات کو مانا جاتا ہے۔ اس طرح، استدلال بنانے کے طریقوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً، **اسلامی فلسفے میں دلیل کے لیے برہان اور قیاس کو اہمیت دی جاتی ہے، جبکہ یونانی فلسفے میں منطق پر زور دیا جاتا ہے، اور مغربی فلسفے میں شواہد کی بنیاد پر دلیلیں بنائی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے مغربی فلسفہ کبھی کبھار کمزور سمجھا جاتا ہے۔** انسان کی آنکھ بھی دھوکہ کھا سکتی ہے، جیسے "سراب" دور سے دیکھنے پر سڑک پر پانی نظر آتا ہے، لیکن قریب جا کر کچھ نظر نہیں آتا۔

درس نمبر 3 خلاصہ:

دلیل اور استدلال

دلیل کا بنیادی مقصد کسی بات کو ثابت کرنا یا مخاطب کو قائل کرنا ہوتا ہے۔ گفتگو یا مناظرے میں جس کی دلیل مضبوط ہوتی ہے، اسی کی بات مانی جاتی ہے۔ اسی لیے علم، فلسفہ اور فکر میں دلیل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

دلیل کو انگریزی میں **Argument** یا **Reasoning** کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس کے لیے استدلال، برہان، حجت، قیاس اور ثبوت جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ہر لفظ دلیل کے ایک خاص پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔

دلیل اور استدلال میں فرق

دلیل نتیجے کو کہتے ہیں، جبکہ استدلال اس طریقۂ کار کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یعنی استدلال راستہ ہے اور دلیل اس راستے کا حاصل۔

استدلال کی اہم اقسام

1. استدلالِ استقرائی (Inductive Reasoning)

اس میں جزئی مشاہدات سے کلی نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

مثال: بار بار مشاہدہ کیا کہ ایک دوا استعمال کرنے سے مریض ٹھیک ہو گیا، تو یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دوا شفا دیتی ہے۔

یہ دلیل یقینی نہیں بلکہ ظنی اور مفروضی ہوتی ہے، اس میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔

2. استدلالِ قیاسی (Deductive Reasoning)

اس میں کلی اصول سے جزئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

مثال:

تمام انسان فانی ہیں،

زید انسان ہے،

لہٰذا زید فانی ہے۔

اگر مقدمات درست ہوں تو نتیجہ یقینی ہوتا ہے۔

3. استدلالِ استنباطی (Abductive Reasoning)

اس میں دستیاب شواہد کی بنیاد پر سب سے بہتر ممکنہ وضاحت اختیار کی جاتی ہے۔

مثال: کمرہ بکھرا ہوا دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کہ شاید کوئی شخص ابھی یہاں آیا تھا۔

4. استدلالِ تمثیل (Analogical Argument)

دو چیزوں میں مشابہت کی بنیاد پر دلیل دینا۔

مثال: جیسے مشین کو چلانے کے لیے انجینئر چاہیے، اسی طرح کائنات کے لیے خالق کا ہونا۔

5. استدلالِ منطقی (Logical Argument)

جو خالص اصولِ منطق پر مبنی ہو اور منطقی قواعد کے مطابق ہو۔

فلسفوں میں دلیل کا فرق

- **اسلامی فلسفہ** میں دلیل کے لیے برہان اور قیاس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔
- **یونانی فلسفہ** میں منطق کو مرکز بنایا گیا ہے۔
- **مغربی فلسفہ** زیادہ تر مشاہدات اور تجرباتی شواہد پر انحصار کرتا ہے۔

مغربی فلسفے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہر حقیقت انسان کی آنکھ سے دیکھی نہیں جاسکتی، کیونکہ حواس دھوکہ بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دور سے سڑک پر پانی نظر آتا ہے، لیکن قریب جا کر کچھ نہیں ہوتا۔ اس کو **سراب** کہا جاتا ہے۔ یہ مثال اس بات کی دلیل ہے کہ صرف مشاہدہ ہر وقت حتمی سچ تک نہیں پہنچاتا۔

خلاصہ:

دلیل علم کی بنیاد ہے، مگر ہر دلیل کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ صحیح استدلال، درست مقدمات اور واضح منہج ہی مضبوط دلیل پیدا کرتا ہے۔

سوالات

1. فلسفہ کا لفظ کن دو یونانی الفاظ سے مل کر بنا ہے اور ان کا مطلب کیا ہے؟
2. اصطلاح کسے کہتے ہیں؟ تعبیر کسے کہتے ہیں؟
3. عملی فلسفہ (Practical Philosophy) اور نظری فلسفہ (Theoretical Philosophy) کیا ہوتے ہیں، اور ان کی تین تین ذیلی اقسام کون سی ہیں؟
4. دلیل اور استدلال میں کیا بنیادی فرق ہے، اور دلیل کا مقصد کیا ہوتا ہے؟
5. مختلف فلسفیانہ روایات (اسلامی، یونانی، مغربی) دلیل کے معاملے میں کیسے مختلف نقطہ نظر رکھتی ہیں؟
6. منطقی مغالطے (Logical Fallacies) کسے کہتے ہیں اور چند عام منطقی مغالطوں کی مثالیں دیں جیسے Ad Hominem، False Cause وغیرہ؟
7. سراب کیا ہوتا ہے اور یہ کس قسم کے حسی دھوکے کی مثال ہے؟
8. استدلال کی تین بڑی اقسام یعنی Inductive Reasoning، Deductive Reasoning اور Abductive Reasoning کیا ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ایک مثال بتائیں؟
9. دلیل کے مختلف نام جیسے برہان، حجت، ثبوت وغیرہ کس طرح دلیل کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں؟

درس نمبر 4

سائنس: سائنس کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ "scientia" سے نکلا ہے، جس کا لفظی مطلب ہے "علم" "یا" جاننا"۔

۔سائنس کے معنی ہمارے عام اردو زبان میں فہم اور سمجھ کے ہوتے ہیں۔ آپ اس کو بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز کا ہر ممکن پہلو سے مشاہدہ، تجربہ اور تجزیہ کیا جائے -اور اس کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ پھر اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو خلق کے نفع اور ان کی تسہیل کے لیے کام میں لایا جائے۔ کسی بھی چیز کے سلسلے میں یہ مسلسل طویل المیعاد اور استقرائی عمل ہوتا ہے- کسی مرحلے پر حتمی طور پر اس کی انتہا نہیں ہوتی۔ یہ خوب سے خوب تر، سہل سے سہل تر اور نفع بخش سے بہترین نفع رسانی تک تدریجی طور پر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ عام طور پر سائنس معلومات کو تجربے سے گزارتی ہے، یعنی اس میں کسی بھی چیز کی معلومات اور تجربے دونوں پہلو شامل ہوتے ہیں۔ تحقیق کے بعد ہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

اس کی ضرورت آپ کو علم کے ہر میدان میں اور فن کے ہر میدان میں درپیش ہے۔ عام طور پر جو لوگ ان حقائق کو نہیں جانتے، وہ سائنس کو ہی ایک علم قرار دیتے ہیں، حالانکہ سائنس حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے جسے فن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اطلاق معلومات و تجربات کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس کو practical اور theory بھی کہا جاتا ہے۔ ہر theory کو practical طور پر حتمی طریقے سے مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا یہ سائنس کا مسلّمہ اصول ہے۔ لیکن theory کو practical میں تبدیل کرنے سے منع بھی نہیں

کیا جاتا۔ اس لیے تمام اہلِ علم تحقیق و استنباط کے عمل کو علم میں ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہ کسی حد پر جا کر منجمد نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد بھی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ بھی سیکھا ہے، وہ اسی طرح سے سیکھا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ہر علم کے ہر میدان کی سائنس موجود ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے اور اس کے ترقی کے امکانات بھی ہیں۔ لیکن ہر علم کی سائنس جدا جدا ہے بلکہ ایک ہی علم کے الگ الگ شعبوں کی سائنس بھی الگ الگ ہے۔ جن لوگوں کو سائنس کی معلومات انتہائی ابتدائی درجے کی ہے وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ سائنس ہی سب کچھ ہے، حالانکہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ایک علم یا ایک عمل کی سائنس دوسرے میدان میں کچھ بھی نہیں۔

سائنس کے ابتدائی معلومات کے اس غلط فہمی کے بعد ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ اس کا تقابل مذہبی معلومات سے کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے خلاف ہے۔ اس وقت دنیا میں ہر سائنس کے میدان میں اکثریت قبضہ انہی لوگوں کا ہے جو ملحد ہیں یا مذہب بیزار ہیں یا اس نظریے کے شکار ہیں کہ مذہب سائنس بیزار ہے یا سائنس کی ترقی سے مذہب روکتا ہے۔ اور ان میں سے بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا خاندانی اور موروثی مذہب اسلام نہیں ہے، اور وہ پے در پے سائنس کے مقابلے میں اپنے مذہبی نظریات کی شکست کا تجربہ کر چکے ہیں اور اپنے مذہب کے تحت احساسِ کم تری کا شکار ہیں۔ چند چیزوں میں نظریات کی شکست کے بعد ان کا اپنے مذہب کے تحت یہ فیصلہ کر لینا انصاف کیسے ہو گیا؟ کیونکہ وہ سائنس کے ماہر تو ہیں، تو ضروری نہیں کہ وہ اپنے مذہبیات کے بھی ماہر ہوں۔ چونکہ مذہب کے لیے بھی ایک فہم اور سمجھ ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیمات کے

ماہرین جس طرح مختلف میدان کے سائنس اور تجربے سے نواقف ہوتے ہیں اور آنکھ بند کر کے سائنس کے غلط ہونے کا حکم صادر کر دیتے ہیں، ٹھیک اس کے برعکس سائنس دان مذہب کی تقلید اور اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ گیلیلیو، ایک سائنس دان تھا، اس نے ایک چیز رکھی جو اس وقت کے چرچ کے خلاف تھی، (گیلیلیو گلیلی ایک مشہور اطالوی سائنس دان تھے جنہوں نے 17 ویں صدی کے اوائل میں یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، نہ کہ کائنات کا مرکز زمین ہے۔ یہ اس زمانے کے مروجہ نظریے کے خلاف تھا جو چرچ کی طرف سے قبول کیا جاتا تھا۔

جب گیلیلیو نے اپنے خیالات کو کھل کر پیش کیا تو کیتھولک چرچ نے ان کی مخالفت کی۔ 1633 میں چرچ نے ان پر مقدمہ چلایا اور ان کے نظریات کو بدعت قرار دیا۔ بالآخر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریے سے دستبردار ہو جائیں اور چرچ سے معافی مانگیں۔ گیلیلیو نے ایک معافی نامہ (recantation) لکھا اور اپنے نظریے سے بظاہر رجوع کر لیا۔ یہ واقعہ 1633 کا ہے۔)

، تو چرچ نے اس کے خلاف مقدمہ چلا دیا۔ جبکہ ایک عرصے کے بعد اس کے نظریات کو تسلیم کر لینا اور لوگوں اور قوم کی طرف سے معذرت پیش کرنا۔

اسی طرح قدیم زمانے میں کئی سائنس دانوں کو اپنی تحقیقات کی وجہ سے سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور پر جب ان کے نظریات اُس وقت کے مذہبی عقائد سے ٹکراتے تھے۔ جیورڈانو برونو کو 1600 میں زندہ جلا دیا گیا کیونکہ وہ کائنات کی لامحدودیت اور دوسرے

سیاروں کی بات کرتا تھا۔ نکولس کوپرنیکس کے سورج مرکزیت کے نظریے کو چرچ نے سختی سے رد کیا۔ گیلیلیو کو 1633 میں گھر میں نظر بند کر دیا گیا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح مائیکل سرویٹس کو 1553 میں مذہبی عقائد سے اختلاف پر زندہ جلایا گیا۔ ان سارے واقعات میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سارے نشانیاں ہیں۔

ان تمام اندازِ فکر کے بیچ بڑی چالاکی سے کچھ لوگوں نے سائنس کا تقابل اسلام اور قرآن، اسلامی تعلیمات سے کرنا شروع کر دیا اور اسی پروپیگنڈا کا سہارا لیا جس کے ذریعے وہ اپنے مذہبی طبقے کو شکست دے چکے تھے۔ اور رائے عامہ میں یہ بات تسلیم کی جا چکی تھی کہ اس دور کے سائنسی ترقیات کے بالمقابل مذہب پسماندہ اور شکست خوردہ ہے۔ تفریقاً کے ساتھ مذہب پر سائنس کی فوقیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ سائنس پر اجارہ رکھنے والی طاقت نے اس نظریے سے اسلام اور سائنس کا تقابل شروع کیا اور اسی پروپیگنڈا کا سہارا لیا۔ لیکن اب تک جن جن اسلامی نظریات کو دانستہ موضوع بنایا گیا، اس میں یہ مذہب بیزار سائنس کے علم برداروں کو شکست اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جتنی آسانی سے انہوں نے اسلام کے علاوہ مذاہب کو کنارہ لگا دیا، یہاں اس طرح کا سخت جان مقابلہ ان کو کرنا پڑ رہا ہے۔ علمائے کرام اس حقیقت کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں کہ قرآن شریف ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس کو میڈیکل سائنس یا کمپیوٹر سائنس یا موجودہ یا آئندہ کسی بھی سائنس سے جوڑنا اس کے مقصدِ نزول کے خلاف ہے۔ ہدایت ہر انسان کی اتنی بنیادی ضرورت ہے کہ اس کو کسی چیز پر معلق یا موقوف کرنا قرآن کریم کے مقصدِ نزول سے نہیں ہے۔

قرآنی آیات اور یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات انسانی قلوب کو متاثر اور دماغ کو مسخر کر دیتی ہیں، جبکہ یہی چیز، دل کا متاثر ہونا اور دماغ مسخر کا ہونا، سائنسی میدان میں ایک طویل مدت کے بعد بھی یقینی نہیں ہو سکتا۔ ہدایت کے لیے نازل ہونے والی کتاب قرآن کریم اور اس کو عملی طور پر پیش کرنے والی شخصیت یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ایسا ہے کہ اس کی افادیت تسلیم کرنے کے لیے سائنسی تجربات کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے، اور یہ پہلو اسلام کے تمام عقائد و اعمال میں بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

علمائے کرام اس ادراک کے باوجود کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں، ان موضوعات پر اسرار و حکم اور نکتہ کی باتیں پیش کرتے رہتے ہیں جو سائنس والوں میں اس وقت زیر بحث ہیں یا اہلِ فلسفہ و منطق نے کبھی ان نظریات کو موضوعِ بحث بنایا تھا۔ سلفِ صالحین کی یہ افادات اور معاصر علمائے کرام کی تحقیقات محفوظ ہیں، جس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سائنس، علوم و تجربات کو مذہبی خدمات کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ پروپیگنڈا کہ مذہب سائنس کے خلاف ہے، دیگر مذاہب کے بارے میں کہاں تک صحیح ہے، وہ اس مذہب کے ماہرین بتا سکتے ہیں۔ لیکن علمائے اسلام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دیگر علم و فن کی طرح سائنس سے بھی کتاب و سنت کی خدمت لی جا سکتی ہے، اور سائنس بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک مؤثر اور بہترین ذریعہ بن سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہو کر مذہب اور سائنس کے دونوں چشموں سے استفادہ کیا جائے۔

بعض علماء قرآن واحادیث کی تشریح اس انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ سائنس کے ساتھ اختلاف نہ کرے اور موجودہ سائنسی نظریات کے مطابق ہو۔ یہ یادرکھنا ضروری ہے کہ قرآن اور احادیث کی اصل تفسیر صحابہ کے اقوال، ان کے عمل اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ سائنس ایک غیر مستقل چیز ہے، جو روز ترقی کرتی ہے اور کل کے دن اپنا نظریہ بدل سکتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ پہلے نیوٹن نے وقت اور جگہ کو مطلق کہا، پھر آئن سٹائن نے ثابت کیا کہ یہ نسبتی ہیں۔ اگر ہم سائنس کے بدلتے ہوئے نظریات کو قرآن کی تفسیر کا معیار بنائیں گے، تو ہمیں کل شرمندگی ہو سکتی ہے۔ قرآن کا مقام بلند ہے، وہ قیامت تک قائم ہے، جبکہ سائنس ابھی تک خود کو مکمل نہیں کر سکی۔ اس لیے ہمیں سائنسی پیمانوں پر نہیں، بلکہ قرآن اور احادیث کی اصل روایات پر قائم رہنا چاہیے، تاکہ ہم کبھی بدلتے حالات کے ہاتھوں بے یقینی کا شکار نہ ہوں۔

بہت سارے لوگ اور کئی علماء یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اندر بہت سی باتیں سائنس سے اختلاف رکھتی ہیں، اور سائنس کی بہت سی باتیں اسلام کے خلاف جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس معاملے میں شدت اختیار کرنے لگتے ہیں، اور بعض لوگ کھینچ تان کر اسلام کی ایسی تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر بات سائنس کے مطابق دکھائی دے، اور کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حالانکہ اس طرح کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارا ایمان اور پختہ یقین یہ ہے کہ اسلام ایک کامل اور مکمل عالمگیری دین ہے۔ اور جو مشہور اعتراضات سائنس کی طرف سے اسلام پر کیے جاتے ہیں، ان کے بارے میں ہم یہاں ایک اصولی جواب اور چند ضمنی جوابات پیش کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ یہ مسئلہ کھل کر واضح ہو جائے اور بات آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

اسلام اور سائنس: اختلاف کا صحیح فہم

سب سے پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ **اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے۔** اسلام جب سے آیا ہے، تب سے اسلام ویسا ہی ہے، اور **اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔** اسلام کی بنیاد وحی پر ہے، اور وحی ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ کے لیے حق اور ثابت رہتی ہے۔

لیکن دوسری طرف **سائنس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔** سائنس کوئی آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ **دن بہ دن ترقی کرتی ہے، بدلتی ہے، اور نئی تحقیق کے ساتھ اپنے نظریات میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔** آج سے پچاس سال پہلے جو سائنس موجود تھی، وہ آج کی سائنس جیسی نہیں رہی۔ اور جو سائنس آج ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی یقینی ضمانت نہیں کہ آنے والے کل میں وہ بالکل اسی شکل میں باقی رہے گی۔

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے:

جو چیز ہمیشہ ایک جیسی ہے، ثابت ہے، کامل ہے — کیا اسے ایسی چیز کے ذریعے پرکھنا درست ہے جو ہر روز بدلتی رہتی ہے؟

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ایک **مستقل حقیقت** کو ایک **غیر مستقل پیمانے** سے ناپنے لگیں۔ یہ انصاف نہیں، بلکہ فکری غلطی ہے۔

سائنس کی تبدیلی کی ایک واضح مثال

مثال کے طور پر، اپنے زمانے میں **نیوٹن (Newton)** یہ کہتا تھا کہ:

- وقت (Time) اور جگہ (Space) مطلق (Absolute) ہیں
- یعنی وقت اور جگہ ہمیشہ ایک ہی انداز میں رہتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی

اس زمانے کے لوگ نیوٹن کی بات کو اتنا بڑا سچ سمجھتے تھے کہ گویا یہی آخری فیصلہ ہے۔ لیکن پھر سائنس نے ترقی کی، تحقیق آگے بڑھی، اور **آئنسٹائن (Einstein)** آیا۔ اس نے واضح کیا کہ:

- وقت اور جگہ مطلق نہیں ہیں
- وقت اور جگہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے
- کائنات (Universe) مسلسل پھیل رہی ہے

یعنی جو بات نیوٹن کے دور میں ”حتمی“ سمجھی جا رہی تھی، سائنس کی ترقی کے بعد وہی بات **بدل گئی** اور حقیقت مزید واضح ہو گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ **سائنس خود اپنے نظریات میں تبدیلی کرتی رہتی ہے**۔ جو چیز آج درست سمجھی جاتی ہے، **ممکن ہے کل وہ غلط ثابت ہو جائے**۔

قرآن اور انسانی پیدائش کی ترتیب

اسی طرح ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب سائنس یہ سمجھتی تھی کہ **قرآن میں انسان کی پیدائش کی ترتیب درست نہیں۔** وہ اعتراض کرتی تھی کہ قرآن نے جن مراحل کا ذکر کیا ہے، وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہیں۔

لیکن پھر جب **بیسویں صدی میں علمِ جنین (Embryology)** نے ترقی کی، تحقیق کا دائرہ وسیع ہوا، اور حقیقتیں واضح ہوئیں تو سائنس کو یہ ماننا پڑا کہ :

انسان کی پیدائش کے مراحل کی جو ترتیب قرآن نے بیان کی ہے، وہی حقیقت کے مطابق ہے۔

یہاں ہمیں ایک بہت بڑا اصول سمجھ میں آتا ہے کہ :

سائنس نے پہلے اس لیے انکار کیا کیونکہ وہ ابھی ترقی یافتہ نہیں تھی،
اور جب سائنس ترقی کر گئی تو اسے حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

اصل بات کیا ہے؟

لہٰذا ہم صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ :

اسلام کامل ہے اور ثابت ہے

اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں

جبکہ سائنس مسلسل بدلتی رہتی ہے

تو پھر یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی چیز کو معیار بنایا جائے جو خود ہر روز بدل رہی ہو، اور اسی بدلتی ہوئی چیز کے ذریعے ایک کامل، ثابت اور ابدی دین کو پرکھا جائے؟

یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے اور انصاف کے بھی خلاف۔

اسلام وہ دین ہے جو **حق پر قائم ہے** اور ہمیشہ قائم رہے گا۔
اور سائنس ایک ایسا میدان ہے جو **مشاہدات اور تجربات** کے ذریعے آگے بڑھتا ہے، اور اس کے نتائج میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اسی لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس مسئلے کو جذبات سے نہیں، بلکہ **اصولی انداز** سے سمجھیں، اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ:

اسلام کو سائنس کے بدلتے ہوئے نظریات کے تابع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اسلام اپنی جگہ حق اور کامل ہے۔

حمل، زندگی اور سائنس کا اعتراض: اسلام کا واضح جواب

یہ ایک نسبتاً پیچیدہ اور حساس مسئلہ ہے جس پر بہت سے لوگ اسلام اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے مطابق **ماں کے پیٹ کے اندر موجود حمل** میں زندگی کا آغاز ایک خاص مدت کے بعد ہوتا ہے، جبکہ سائنس کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی تو ابتدا ہی سے موجود ہوتی ہے۔

سائنس کا کہنا یہ ہے کہ جب حمل ماں کے پیٹ میں ٹھہرتا ہے، تو وہ پہلے ہی دن سے زندہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں زندگی کے آثار موجود ہوتے ہیں۔ سائنس اس بات کو دلیل بنا کر پیش کرتی ہے کہ:

- نطفہ کے اندر زندگی کے جراثیم (Life germs) پائے جاتے ہیں
- اور جب جراثیم موجود ہوں تو زندگی کا شمار پہلے دن ہی سے ہونا چاہیے

چنانچہ سائنس اس بنیاد پر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ **حمل کے پہلے دن سے ہی اسے ایک زندہ انسان سمجھا جائے۔**

اور پھر اسی کے نتیجے میں یہ اعتراض کھڑا کیا جاتا ہے کہ:

اگر اسلام کہتا ہے کہ **حمل کے سو (یا ایک مخصوص مدت) کے بعد زندگی آتی ہے**
تو پھر اسلام کا یہ موقف سائنس کے خلاف کیوں نہیں؟

اور اسی بنیاد پر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

اسلام کے نزدیک اگر **حمل سو دن کے بعد ضائع کر دیا جائے** تو وہ قتل کے حکم میں آتا ہے،
جبکہ سائنس کے نزدیک تو وہ پہلے دن ہی زندگی ہے،
تو پھر قتل کا حکم پہلے دن سے کیوں نہیں؟

یہاں بہت سے لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ وہ **زندگی کے صرف ایک معنی** لے لیتے ہیں، اور اسی کو آخری معیار بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے زندگی کو سمجھنے کے لیے **ایک نہایت اصولی اور منصفانہ تقسیم** بیان کی ہے۔

اسلام کا اصولی جواب: زندگی کی دو قسمیں

اسلام اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے زندگی کی دو بنیادی قسمیں واضح کرتا ہے:

(1) حیاتِ نباتاتی

یہ وہ زندگی ہے جو صرف **وجود، بڑھنے، نشوونما** اور حرکت کی ابتدائی کیفیت کی صورت میں ہوتی ہے۔

یعنی ایسی زندگی جس میں:

- جسمانی بڑھوتری ہو
- خلیات بن رہے ہوں
- جسم کی تشکیل کا عمل جاری ہو

یہ زندگی صرف "وجود" کی سطح پر ہوتی ہے، اس میں انسانی شعور، انسانی شناخت اور انسانی جان کا وہ مقام نہیں ہوتا جسے شریعت قتل کے حکم میں شمار کرے۔

(2) حیاتِ حیوانی

یہ وہ زندگی ہے جو محض جسمانی بڑھوتری نہیں بلکہ **حقیقی انسانی زندگی** کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہاں زندگی کا مطلب صرف “جراثیم یا خلیات” نہیں رہتا بلکہ:

- ایک واضح انسانی جان
- انسان کی مستقل شناخت
- انسانی زندگی کی تکمیل کی طرف سفر
- اور وہ مرحلہ جس کے بعد شریعت اسے باقاعدہ “انسان” شمار کرتی ہے

اسلام کے نزدیک **ماں کے پیٹ کے اندر حمل** جب ایک خاص مدت کے بعد اس درجے میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اسے انسانی جان سمجھا جاتا ہے، اور اسی لیے اس کے بعد حمل کو ضائع کرنا صرف “طبّی عمل” نہیں رہتا بلکہ **قتل کے حکم میں آ جاتا ہے۔**

سائنس کے اعتراض کا اصل کمزور نکتہ

سائنس کہتی ہے کہ چونکہ نطفے کے اندر جراثیم موجود ہیں، لہٰذا یہ پہلے دن سے زندگی ہے۔
اسلام اس پر سوال اٹھاتا ہے کہ:

اگر صرف “جراثیم” کو زندگی مان لیا جائے تو پھر یہ اصول کہاں جا کر رکے گا؟

کیونکہ جراثیم اور زندگی کے ابتدائی آثار تو صرف نطفے میں نہیں ہوتے، بلکہ:

- پتے میں بھی زندگی کے آثار ہوتے ہیں

- کیڑوں میں بھی زندگی ہوتی ہے
- چھوٹے جانداروں میں بھی زندگی ہوتی ہے
- بہت سی چیزوں میں حیاتیاتی وجود (Biological existence) موجود ہوتا ہے

اب اگر ہم سائنس کے اس اصول کو پکڑ لیں کہ:

"جہاں جراثیم یا زندگی کے آثار ہوں، وہ مکمل انسانی جان ہے"

تو پھر لازم آئے گا کہ ہم ہر جگہ اسی اصول کو لاگو کریں۔

پھر انصاف کہاں رہے گا؟

یہاں اسلام بہت واضح انداز میں یہ بات سمجھاتا ہے کہ:

آپ نے نطفے کے جراثیم کو "زندگی" قرار دے کر اسے انسانی جان کا درجہ دے دیا، لیکن پھر اسی اصول کے مطابق آپ کو ہر اس چیز کو بھی انسانی جان کہنا پڑے گا جس میں زندگی کے آثار موجود ہیں۔

پھر سوال یہ ہے کہ:

- اگر نطفے میں موجود جراثیم کو زندگی کہہ کر اس کو اتنا بڑا درجہ دیا جا رہا ہے تو پتے میں موجود زندگی کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟

- کیڑے مکوڑوں میں موجود زندگی کو کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے؟
- بہت سی چیزوں کو کھایا جاتا ہے، ختم کیا جاتا ہے، کاٹا جاتا ہے

تو پھر وہاں یہ اصول کیوں نہیں لگایا جاتا؟

یہ دوہرا معیار کیوں؟

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ:

ایک جگہ "جراثیم" کو زندگی کہہ کر اسے قتل کا مسئلہ بنا دیا جائے،
اور دوسری جگہ "جراثیم" کو کچھ بھی نہ سمجھا جائے؟

اسلام کا فیصلہ کس بنیاد پر ہے؟

اسلام کا فیصلہ جذبات پر نہیں بلکہ اصول پر ہے۔
اسلام زندگی کے ہر درجے کو ایک ہی حکم میں نہیں رکھتا، بلکہ فرق کرتا ہے کہ:

- کب حمل صرف نشوونما کے مرحلے میں ہے
- کب حمل انسانی جان کے درجے میں پہنچ چکا ہے
- کب وہ مرحلہ آگیا ہے جہاں شریعت اسے مکمل انسانی حرمت دیتی ہے

اسی لیے اسلام یہ کہتا ہے کہ:

حمل کے اندر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب وہ محض خلیات کا مجموعہ نہیں رہتا، بلکہ انسانی جان کی حقیقت بن جاتا ہے۔

اور اسی مرحلے کے بعد اس کو ضائع کرنا قتل کے حکم میں آتا ہے۔

نتیجہ (Conclusion)

لہٰذا اس مسئلے میں اسلام اور سائنس کے درمیان جو ٹکراؤ دکھایا جاتا ہے، وہ دراصل **غلط فہمیاں اور غلط معیار** کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ حمل میں کوئی وجود نہیں ہوتا،
بلکہ اسلام یہ سمجھاتا ہے کہ:

ہر حیاتیاتی وجود کو فوراً ‘‘انسانی جان’’ کا درجہ دینا علمی اور عقلی انصاف نہیں۔

اسلام نے زندگی کی حقیقت **کو درجات** میں رکھا ہے،
اور اسی درجے کے مطابق شریعت نے احکام مقرر کیے ہیں۔

اسی لیے اسلام کے نزدیک:

- ابتدائی مرحلے میں ‘‘حیات’’ کا ایک درجہ ہے

- اور مخصوص مدت کے بعد ''انسانی جان'' کا درجہ آجاتا ہے اور پھر اس کے بعد حمل کو ضائع کرنا سنگین جرم بن جاتا ہے۔

کزن میرج: اسلامی اختیار اور سائنسی حقیقت کا متوازن تجزیہ

کزن میرج کے حوالے سے یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ گویا اسلام ہر حال میں اسے لازم قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کزن میرج کو جائز رکھا ہے، مگر اسے ضروری یا فرض نہیں کیا۔ یہ ایک اختیار ہے، جس کا استعمال حالات کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔

سائنس یہ کہتی ہے کہ کزن میرج سے بعض جینیاتی مسائل کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ ہر صورت میں حتمی نہیں۔ کچھ خاندانوں میں یہ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، اور کچھ میں نہیں۔ اسلام کا موقف یہی ہے کہ یہ ایک اجازت ہے، مگر جہاں جینیاتی مسائل ہوں، وہاں اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔

کسی خاندان میں اگر طبّی یا جینیاتی خطرہ موجود ہو تو اسلام نہ صرف مشورہ دیتا ہے کہ ایسے حالات میں کزن میرج نہ کریں، بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ ضرورت کے تحت ڈاکٹرز سے مشورہ لیا جائے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کزن میرج کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی شادیاں ہوتی ہیں، اور وہاں بھی بعض اوقات جینیاتی مسائل سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی مطلق اصول نہیں ہے کہ ہر کزن میرج نقصان دہ ہو گی۔

اسلام نے اسے ایک آپشن کے طور پر رکھا ہے۔ اگر آپ کے خاندان میں کوئی خطرہ نہیں، تو آپ کر سکتے ہیں۔ اگر خطرہ ہے، تو نہ کریں۔ یوں اسلام میں اس مسئلے کو اعتدال کے ساتھ اور عملی حکمت کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔